شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

شاہ بلیغ الدینؒ

محفل ختم ہوگئی تو لوگ گھروں کو چلنے کے لیے اٹھے۔

مجمع بڑا تھا۔اس لیے آہستہ آہستہ لوگ اپنی جگہ سے ہٹ رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو صاحبِ محفل کو سلام کرنے اور ان سے ہاتھ ملانے کے لیے رکے ہوئے تھے۔ان میں بڑی تعداد ان کے عقیدت مندوں کی تھی اور کچھ قریب کے ملنے والے تھے جو مزاج پرسی کر لینا چاہتے تھے۔

یہ اجتماع سید اسماعیل شہید صاحب کی وجہ سے ہوا تھا۔سید صاحب تحریکِ آزادی کے بہت بڑے مجاہد تھے۔ بالاکوٹ صوبہ سرحد میں حضرت سید احمد شہید کا مزار ہے۔ یہ شاہ اسماعیل شہید کے مرشد اور رہنما تھے۔ان کا اپنا مزار بھی وہیں پاس ہی ہے۔شاہ صاحب بلا کے ذہین اور بے تکان بولنے والے تھے۔اللہ نے علم بھی دیا تھا،عمل بھی اور طلاقتِ لسانی بھی۔

صراطِ مستقیم جیسی کتاب انھوں نے مرتب کی اور ''تقویۃ الایمان'' جیسی کتاب لکھی جو لاکھوں کی تعداد میں بکی۔ ''آثار الصنادید'' کے آخری باب میں سید احمد خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ہفتہ میں دو دن جمعہ اور منگل کو وہ جامع مسجد دہلی میں تقریر کرتے اور جہاں کسی بھٹکے ہوئے گروہ کی خبر پاتے۔وعظ و نصیحت کے لیے بے تکلف وہاں پہنچ جاتے۔

دل میں ہمیشہ ایک ہی تڑپ رہتی تھی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو لوگوں کو پہنچا دیں۔ ہر مسلمان کو حکم ہے کہ جو علم اسے حاصل ہو وہ دوسروں تک پہنچا دے تا کہ علم پھیلتا رہے۔زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ دین کی باتیں جاننے لگیں اور اُن کے اخلاق درست ہوں۔

صحابہ کرام، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں سے اٹھتے تو دوسروں کو جو محفلوں میں حاضر نہ رہتے اس نشست کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔دین کو پھیلانے اور اخلاق کو درست کرنے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے۔ جب تک یہ بات ہمارے ذہنوں میں رہی ہم یہ کام کرتے رہے۔نتیجہ یہ کہ دور دور تک اسلام پھیلا۔جب سے ہم نے اس فریضے کو بھلا دیا، حال یہ ہے کہ بہت سے مسلمان بھی بس نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔دین کی ابتدائی باتیں تک وہ نہیں جانتے۔نہ کوئی دوسرے کو اچھے کام پر ابھارتا ہے، نہ بری بات پر ٹوکتا ہے۔شاہ صاحب کو اس بات کا بڑا احساس تھا۔ جہاں وہ دیکھتے کہ مناسب موقع ہے۔لوگوں کو دین کی باتیں بتانے کھڑے ہو جاتے۔اکثر راستہ چلتے چلتے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر رک

جاتے اور جتنے لوگ جمع ہوتے، ان سے گفتگو کرنے لگ جاتے۔

جس محفل کا یہ تذکرہ ہے وہ ان کے وعظ کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ لوگوں سے مل ملا کر وہ رخصت ہو رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا دور سے ایک شخص دوڑتا ہوا ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ وہ شخص قریب آیا تو آپ نے دیکھا آس پاس کے کسی دیہات کا رہنے والا ہے۔ ہانپتا کانپتا وہ ان کے پاس آیا اور خاموش ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے پوچھا ..... بھائی کیا بات ہے؟ کیوں دوڑے چلے آ رہے ہو؟ .....اس نے بڑے افسوس سے کہا..... جی کیا بتاؤں، بڑا بدقسمت ہوں۔ راستہ بھر دوڑتا ہوا آیا۔ پھر بھی محروم رہا۔

شاہ صاحب نے پوچھا..... کس چیز سے محروم رہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی!

اس نے جواب دیا..... جی میں تو آپ کا وعظ سننے آیا تھا۔ وقت ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ لوگ جا رہے ہیں۔ آپ کا وعظ ختم ہو گیا۔ بس اسی کا افسوس ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا..... اس میں افسوس کی کیا بات ہے، وہی باتیں جو میں ہزاروں کے مجمع کو سنا چکا ہوں تم کو بھی سنا تا ہوں۔ بیٹھ جاؤ! لفظ بلفظ وہی تقریر دہرا دوں گا۔

اس نے بڑے حیرت سے شاہ صاحب کی طرف دیکھا پھر بولا..... مجھ اکیلے کے لیے آپ یہ تکلیف کریں گے؟

فرمایا..... کیوں نہیں! پہلے بھی سب کو سنا کر ایک کو خوش کرنا مقصود تھا۔ اب بھی اسی مالک الملک خالقِ کُل کو خوش کروں گا۔

وہ شخص خوشی خوشی بیٹھ گیا تو شاہ صاحب نے اپنی طویل تقریر اس کے آگے من وعن دہرا دی۔ کچھ نہ پوچھئے کہ خوشی سے اس کا کیا حال ہوا۔

ایک غریب کا دل رکھنا اور اس حسنِ اخلاق سے بڑی بات ہے..... بہت بڑی بات!

(''روشنی''، ص ۲۶ تا ۲۸)

قادیانی تحریک: پس منظر اور پیش منظر

زیڈ اے سلہری

احمدیہ تحریک جسے عرفِ عام میں قادیانی تحریک کہا جاتا ہے کیسے معرضِ وجود میں آئی؟

اس سوال کا جواب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک ہم ولیم ہنٹر کی اس رپورٹ کا تفصیلی جائزہ نہ لیں جو انھوں نے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے عنوان سے برطانوی حکومت کو پیش کی تھی اور جس پر ''کیا وہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے مذہباً پابند ہیں'' کا اشتعال انگیز ذیلی عنوان ثبت تھا۔ یہ کتاب رپورٹ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ وہائٹ ہال میں اس پر گہرا غور وفکر ہوا اور اس رپورٹ کے مندرجات کی اساس پر مسلمانانِ ہند کے متعلق ایک نئی پالیسی اختیار کی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ایک ایسی نبوت جس کا مقصد اولیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں پر جہاد کی پابندی ختم کی جائے اور انھیں برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ امن وامان سے رہنے کی تلقین کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کتاب کا مرزا صاحب کی نبوت سے کیا تعلق ہے؟

''سر ولیم ہنٹر'' کو جو ملکۂ ہند کی حکومت میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ مسلمانوں کے معاندانہ رویہ پر بے حد تشویش تھی جس کا مظاہرہ سید احمد شہید کی ملک گیر تحریک میں ہوا تھا جس نے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ وہ کسی بھی غیر ملکی اور غیر مسلم حکومت کے زیرِ سایہ مسلمان نہیں رہ سکتے اور یہ کہ ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے۔ دارالحرب کے اس تصور کے بعد مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے تھے۔

اولاً..... غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کیا جائے اور ہندوستان کو ایک بار پھر دارالاسلام میں تبدیل کیا جائے جہاں مذہب کا علم لہرایا جائے۔

ثانیاً .....کسی ایسی جگہ ہجرت کی جائے جہاں اسلامی تعلیمات پر بلا روک ٹوک نہ صرف عمل کیا جا سکے بلکہ ان کی توسیع واشاعت بھی ہو سکے۔

اس اندازِ فکر نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور انہیں ملکۂ ہند کی حکومت کے خلاف اگر عملی طور پر نہیں تو ذہنی طور پر بغاوت کے لیے ابھارا۔

وہابی تحریک جس کے عروج کا علم چالیس برس تک پورے شمال مشرقی اور شمال مغربی ہندوستان پر لہراتا رہا اس وقت

برطانوی حکومت کے جور واستبداد کا نشانہ بنی ہوئی تھی لیکن سر ولیم کے نقطۂ نظر میں یہ جسمانی جبر وایذا مسلمانوں کے مسئلہ کا مناسب اور دیرپا حل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اصل حل یہ تھا کہ مسلمان عقیدۃً برطانوی حکومت کا سایہ قبول کرلیں یا کم از کم اسلامی تعلیمات کی توضیح وتشریح اس انداز سے نہ کریں جس سے انگریزی حکومت کے خلاف دشمنی اور نفرت کے جذبات ابھریں۔

یہ کیسے ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی حل تھا کہ مسلمانوں کے دل ودماغ سے جہاد اور غیر ملکی سامراج کے خلاف بغاوت کا جذبہ نکال دیا جائے لیکن مسلمان کی عام رائے اس قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھی۔

احمدیہ تحریک کے ایک سرسری جائزے سے ہی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اس تحریک کا مقصد عظیم اسلامیانِ ہند کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لیے صلح وآشتی کا وہ جذبہ پیدا کرنا تھا جس کی سر ولیم کو آرزو تھی۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کی تعلیمات میں جہاد کو منسوخ کردیا گیا اور آیت ''**اولو الامر منکم**'' کا مطلب یوں ڈھالا گیا کہ ''**اولو الامر**'' سے مراد برسرِ اقتدار حکومت ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اس لیے ''عامۃ المسلمین کا یہ سمجھنا کہ احمدی انگریز کا خود کاشتہ پودا ہیں بلاوجہ نہیں تھا'' اور احمدی رہنماؤں کے مسلسل فخریہ اعلانات نے کہ انگریزوں کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات ہیں اس تأثر میں اور وزن پیدا کردیا۔ یہ بات عام تھی کہ انگریز سرکاری ملازمتوں میں احمدیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ:

> ''وائسرائے کی ایگزیکٹو میں ایک ممبر کی حیثیت سے سر ظفر اللہ کا تقرر اس کی ذاتی قابلیت سے زیادہ اسی حقیقت کی وجہ سے تھا۔''

یہ پس منظر اسی احمدیہ تحریک کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے کافی تھا مسلمان جو اپنے زوال اور اپنی تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب کے آجانے سے بے حد مضطرب تھے۔ برتریٔ تہذیب کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بجا طور پر یہ سمجھنے لگے کہ مغربی تہذیب صرف اسی صورت میں یہاں قدم جما سکتی ہے کہ مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم کو نیست ونابود کردیا جائے۔ سر ولیم ہنٹر کی کتاب اس حقیقت اور خاص طور پر مسلمانانِ بنگال کی صورت حالات کی غماز ہے۔

تاہم جس چیز نے مسلمانوں کے دلوں میں احمدیت کے خلاف انتہائی نفرت اور دشمنی پیدا کردی وہ یہ تھی کہ مرزا صاحب نے اپنی تحریک اور مشن کی اساس ختم نبوت کے مسلّمہ عقیدہ کی قطعی تنقیص پر رکھی۔ یہ بات تو خیر قرینِ قیاس ہے کہ ایک نئے عقیدے کے عنوان سے ایک نئی نبوت کی بنیاد رکھی جائے جیسا کہ بہاء اللہ نے کیا۔ لیکن اسلام میں ایک نئی نبوت کا دروازہ کھولنا اسلام کی بنیادی قدروں کے لیے خطرناک طور پر تباہ کن ہے اور اگر اس بات کی سند مل جائے کہ کسی کلمہ گو کو کافر کہا جاسکتا ہے تو:

> ''دائرۂ اسلام میں احمدیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ احمدی رسول اللہ پر ایمان لاکر مسلمان نہیں ہوجاتے جس طرح عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مان کر یہودی نہیں ہوجاتے یا خود مسلمان حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ پر ایمان رکھ کر عیسائی یا یہودی نہیں بن جاتے۔''

یہ ختمِ نبوت کا عقیدہ ہی تو ہے جس پر مسلمان ایک امت کی حیثیت سے منسلک اور منظّم ہیں۔ ختمِ نبوت کا تصور جسے

واضح اور غیر مبہم الفاظ میں قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے اس نفی سے اجماعِ امت کی بنیادیں متزلزل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں ختمِ نبوت کا تصور محض رسول اللہ کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ قرآنی نقطۂ نظر سے انسانیت کے ارتقاء کے بنیادی اصولوں کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور اسے علامہ اقبالؒ نے اپنے لیکچرز میں خوب واضح کیا ہے۔ علامہ کی نگاہ میں ختمِ نبوت انسان کی تکمیل کا نشان ہے جسے قرآن کے ذریعہ وہ تمام ہدایات عطا کر دیں جن کی اسے اپنی روحانی اور مادی ترقی کے لیے ضرورت ہو سکتی تھی اور اسے اپنی قسمت خود تعمیر کرنے کا مختار بنایا گیا۔ قرآن نے اپنی ذمہ داریوں کا پُرزور اعتراف کیا ہے۔ خدا نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار کہا: اے رسول! کہہ دے کہ اگر میں چاہتا تو دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا لیکن یہ انسان کے منصبِ اختیار کے خلاف ہوتا۔ اس لیے اسے فرمانِ خداوندی کے قبول یا رد کرنے میں اختیار دیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو ایمان لانے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ دین مکمل ہو جانے کے بعد ''**اتممت علیکم نعمتی**'' انسانیت کو خدائے برتر کے مقاصد کو اپنی سعی و کوشش کے مطابق پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

اس بحث کی روشنی میں مرزا صاحب کے مشن میں کوئی جان نہیں اور ان کے پیرو کار امتِ مسلمہ میں شمار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ بات تحقیق طلب ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے مشن میں اتنی بڑی کامیابی کیسے ہوئی۔ دراصل اس کے اسباب ان حالات کی پیداوار ہیں جن میں انھوں نے کام کیا۔ برطانوی حکومت کی مذہبی رواداری کی پالیسی کا مطلب ہر قسم کے مذہبی اور فرقہ وارانہ مناقشات کے لیے صلائے عام تھا۔ مسلمانوں کا شیرازہ پہلے ہی بکھر چکا تھا جب کہ ان کے طریقہ ہائے تعلیم اور قوانینِ تعزیر سے جس نے انہیں مجلسی، مذہبی اور قانونی طور پر ایک لڑی میں منسلک کر رکھا تھا ختم کر دیئے گئے اور اس طرح مذہبی تعلیمات اور ان کی تشریح و توضیح کا کام ان جاہل علماء کے ہاتھوں میں چلا گیا جو ان کے ساتھ کھیلنے لگے۔

اس کے برعکس عیسائی مشن اور آریہ سماج جیسے انقلابی ہندو اسلام پر رکیک حملے کر رہے تھے کہ جنگِ آزادی میں شکست کھا جانے کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا یہ کمزور ترین پہلو سمجھا جاتا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس تثلیثی کش مکش کی قوتیں نابرابر تھیں۔ ایک طرف روپیہ اور تعلیم تھے تو دوسری طرف تعلیم کی کمی اور تنظیم کا فقدان۔ اس کش مکش میں مسلمان پستے چلے گئے۔ ان حالات میں مرزا صاحب نے اسلام کی طرف داری کا بہروپ اختیار کیا۔ فریب خوردہ عوام نے سراہا تو مرزا صاحب مطلق العنان لیڈر شپ کے خواب دیکھنے لگے۔

اس کامیابی کے ساتھ برطانوی حکومت کی ضرورت بھی ابھری کہ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ پیدا کی جائے لیکن یہ مفاہمت جہاد اور دارالحرب کے تصورات کو ختم کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ ان خطوط پر پہلے بھی کوشش کرائی جا چکی تھی۔ بعض مدرسۂ فکر کے رہنما غیر ملکی حکومت کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کا اعلان کر چکے تھے لیکن یہ کوششیں مسلمانوں میں قبولیتِ عامہ حاصل نہ کر سکیں۔ مرزا صاحب کی اپنی بڑھتی ہوئی آرزو کے ساتھ ساتھ انگریز کی ضرورت تھی جس نے انہیں نبوت جیسے بلند مقام پر ہاتھ مارنے کے لیے ابھارا۔ سمجھا یہ گیا کہ ان تصورات اور عقائد کی